ہی وہ ملک ہے جس نے طالبان حکومت کو تسلیم کیا تھا۔ امریکہ نے مسلسل پاکستانی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ اسامہ بن لادن کو حوالے کرنے کے لیے افغانیوں پر دباؤ ڈالیں لیکن پاکستانیوں کا کہنا ہے کہ وہ ایسا کرنے کے قابل نہیں۔

پاکستان جو کہ سرد جنگ کے دوران روس کے خلاف امریکہ کا قریبی حلیف تھا اب اس کے اسلام پسندی کی جانب جھکاؤ، مسلسل فوجی حکومت اور معاشی بدنظمی کے وجہ سے اس کا مشرق میں حریف ملک بھارت اب امریکہ کا قریبی دوست بن چکا ہے۔ بھارت کی نصف صدی پر محیط جمہوریت کو امریکہ میں طویل عرصے سے پزیرائی حاصل ہے اور ۱۹۹۰ء کے بعد سے بھارت نے مرکزی سوشلسٹ پلاننگ ترک کرنے کے ساتھ مغرب کے ساتھ مخاصمانہ رویے کو بھی خیرباد کہہ دیا ہے۔ بھارت کی سافٹ ویئر کی صنعت میں ہوشربا ترقی کے ساتھ امریکہ کی کیلی فورنیا میں سیلیکون ویلی میں کام کرنے والے بھارتیوں کی ۶۰ ارب ڈالر کی سالانہ کمائی ایسی وجوہات ہیں کہ جنہوں نے واشنگٹن کو نیو دہلی کے مزید قریب لانے میں بڑی مدد فراہم کی ہے اور پاکستان کی ناراضی اور تنہائی میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

حال ہی میں پاکستانی صحافیوں کے ایک گروپ نے چند امریکی صحافیوں سے یہ سوال پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ امریکی پریس میں پاکستان کو منفی انداز میں پیش کیا جاتا ہے؟۔ لیکن جب ان پاکستانی صحافیوں سے پاکستان میں اسلامی نشاۃ ثانیہ، انتہا پسندی، غریبوں کے لیے سکولوں کی کمی، فوجی حکومت اور دوسرے مسائل کے بارے میں پوچھا گیا تو پاکستانی صحافیوں نے پشیمانی کے ساتھ اس بات پر اتفاق کیا کہ یہ سب کچھ ایک حقیقت ہے۔

بہت سے تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ تمام برائیوں کی جڑ یہ ہے کہ ملک کے تعلیم یافتہ راہنما اب تک ملک کی ۱۴۰ ملین آبادی کو ایک بھرپور تعلیمی نظام دینے میں ناکام رہے ہیں۔ اسی ناکامی کے سبب والدین کی بڑھتی ہوئی تعداد مدارس کی طرف رجوع کرتی ہے جہاں بنیاد پرستی اور عدم برداشت کے امتزاج سے دنیا بھر میں مذہبی جنگوں کا بارود پیدا ہو رہا ہے۔

[بن باربر واشنگٹن ٹائمز کے لیے امریکی وزارتِ خارجہ کے وقائع نگار ہیں۔]

اسلام کی قرونِ وسطیٰ والی فوجی چوکیاں

تحریر: حسین حقانی

ترجمہ: خورشید احمد سعیدی

کئی صدیوں تک مغربی اثرات سے بچنے کی خاطر مسلمان بچے اور نوجوان اسلامی مدرسوں میں جمع ہوتے اور خاموشی سے ان اسلامی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے ہیں جو بغیر کسی تبدیلی کے ایک طویل عرصے سے نسل در نسل چلتی آئی ہیں۔ لیکن گزشتہ دو عشروں سے انقلاب، عالمی طاقتوں کی سیاست اور غربت نے مل کر کچھ مدارس میں بنیاد پرستی کی تعلیمات کو ایک بے قابو رخ پر ڈال دیا ہے۔ اور اب گلوبلائزیشن کے سب سے خطرناک مذاقوں میں سے ایک یہ ہے کہ یہ جہادی جامعات دنیا بھر میں قرونِ وسطیٰ کی تعلیمات پھیلا رہی ہیں۔

میری عمر نو سال تھی جب میں نے کراچی میں واقع ایک مدرسے کے سخت فرش پر زانوئے تلمذ تہہ کیے۔ اس وقت مجھے قرآن کی یہ آیت رٹوائی گئی: ''كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ'' (تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے نکالے گئے ہو، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے منع کرتے ہو، اور اللہ پر ایمان لاتے ہو)۔

حافظ گل محمد ہمارے قاری صاحب تھے۔ انہوں نے ہماری کلاس کے تیرہ لڑکوں میں سے ہر کسی کو یہ آیت عربی زبان میں یاد کروادی۔ ہم میں سے بعض نے اس کا اردو ترجمہ بھی حفظ کرلیا۔ وہ ہمیں یہ بتاتے رہتے تھے کہ یہ اللہ کا کلام ہے جو امت مسلمہ کی تعریف کرتا ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ مسلمانوں کا مقصدِ حیات کیا ہے۔ وہ خود حافظ تھے جنہیں قرآن کی ایک سو چودہ سورتوں کی چھ ہزار تین سو چھیالیس آیات ازبر تھیں۔

بہت سے طلباء بنیادی اسلامی تعلیمات سیکھنے اور قرآن پڑھنے کے لیے مدرسہ میں گل محمد کی کلاس

---

* Husain Haqqani, "Islam's Medieval Outposts," *Foreign Policy*, Nov/Dec. 2002

میں آئے۔ پاکستان میں صرف چند لوگ عربی بول سکتے ہیں لیکن ہر ایک قرآن پاک کو پڑھنا اور سیکھنا چاہتا ہے۔ میں نے سات سال کی عمر میں پہلی بار مکمل قرآن پڑھ لیا تھا۔ بنیادی اسلامی تعلیمات کو سمجھنے اور قرآن کو تجوید سے پڑھنے کے لیے مدرسہ میں میرا داخلہ جزوقتی تھا۔

مدرسہ کے باقی اساتذہ کی طرح گل محمد کے ہاتھ میں بھی ایک ڈنڈا ہوتا تھا لیکن مجھے یاد نہیں کہ اس نے اسے کبھی استعمال کیا ہو۔ دین کے بارے میں میرا تجسس انہیں پسند تھا اور میرے ساتھ وہ صرف ایک بار ناراض ہوئے تھے۔ ہوا یوں کہ میں ایک دن انگلش سکول سے سیدھا مدرسہ چلا آیا۔ میں نے سکول یونیفارم یعنی سفید قمیص، سرخ ٹائی اور خاکی پینٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس نے کہا: آج تم نے ایک فرنگی کی طرح لباس پہنا ہوا ہے۔ کل تم اسی کی طرح سوچنا اور زندگی گزارنا شروع کر دو گے اور یہ جہنم کی طرف تمہارے سفر کی ابتدا ہوگی۔

حافظ گل محمد نہ تو اخبار پڑھتا اور نہ ہی ریڈیو پر خبریں سنتا تھا۔ اس کے پاس چند کتابیں تھیں۔ ایک بار میں اس کے لیے شام کا کھانا لایا تو اس نے مجھے کہا: ''اسلام سیکھنے کے لیے آپ کو بہت زیادہ کتابوں کی ضرورت نہیں۔ سیدھا راستہ وہی ہے جسے قرآن نے بیان کر دیا ہے اور اسے ایک یا دو تفسیروں کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔ جبکہ الجھن میں ڈالنے والے راستے کئی ہیں۔ میرے پاس ایسی کتابیں ہیں جن کی مجھے سیدھے راستے پر رہنے کے لیے ضرورت ہے''۔ اس نے کبھی فلم نہیں دیکھی تھی اور مجھے بھی نصیحت کی کہ کوئی فلم نہ دیکھوں۔ اس نے صرف ایک بار فوٹو کھنچوایا جب اسے پاسپورٹ بنوانے اور حج ادا کرنے کے لیے مکہ جانا تھا۔ ان دنوں پاکستان میں ٹیلی ویژن متعارف ہو رہا تھا اور گل محمد نے مستقبل کو بہت پریشان کن محسوس کیا۔ ایک حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ گھروں میں گندی عورتوں کے گانے اور ڈانس قیامت کی نشانیوں میں سے ہیں۔ گل محمد کا یقین تھا کہ ٹیلی ویژن اس پیشین گوئی کو پورا کر دے گا کیونکہ یہ ہر گھر میں ناچتی گاتی عورتوں کی تصویریں لے آئے گا۔

وہ مدرسہ جس میں میں پڑھتا تھا اس کا مہتمم غیر سیاسی انداز میں مغرب کا مخالف تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ کمیونسٹ بُرے ہیں کیونکہ وہ خدا کے وجود کا انکار کرتے ہیں جبکہ مغربی لوگ بداخلاق ہیں۔ وہ شراب پیتے ہیں اور زنا کرتے ہیں۔ مغربی عورتیں حجاب نہیں کرتی۔ مغربی تہذیب مال جمع کرنے کی پاگل دوڑ کی

حوصلہ افزائی کرتی ہے۔نماز اور ذکر کی بجائے ناچ گانے مغربی طرز زندگی ہے۔گل محمد کے پاس ان مسائل کا حل ان سب سے اجتناب تھا۔''امت مسلمہ کو مغرب اور اس کے طرز زندگی سے دور رہنا چاہیے''۔

لیکن یہ ۱۹۶۰ء کی باتیں ہیں۔اگرچہ پاکستانیوں کی زندگی میں دین بہت اہم تھا پھر بھی دین کی بجائے مادی کامیابیوں کا حصول طلباء کے مستقبل کا تعین کرتا تھا۔میری کلاس میں ہر طالب ضروری عبادات سیکھنے کے بعد مدرسہ چھوڑتا گیا۔میں تقریباً چھ سال تک مدرسے کا جز وقتی طالب علم رہا لیکن آخر کار میں نے محسوس کیا کہ باقاعدہ تعلیم کو وقت دینا ضروری ہے تاکہ میں کالج پہنچ سکوں۔گل محمد اس بات پر بہت مایوس ہوا کہ میں نے دینی تعلیم کی سند حاصل نہ کی لیکن وہ بہرحال ناچاہتے ہوئے بھی سمجھ گیا کہ متوازی تعلیمی نظام سے میں کیوں ڈگری حاصل نہیں کرنا چاہتا تھا:''تم میری طرح ایک مولوی نہیں بننا چاہتے جس کی تنخواہ قلیل ہوتی ہے اور امیروں اور وڈیروں کی نظر میں جس کا کوئی احترام نہیں ہوتا''۔

گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کو دہشت گردوں کے حملوں سے پہلے چار عشرے تک یہی صورت حال تھی۔یہ وہ دور تھا جب پالیسی ساز ادارے مغرب سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے افکار میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے کیونکہ وہ پس ماندہ مدرسوں کے نیم خواندہ ملاؤں کے مقابلے میں عرب ممالک میں انرجی پالیسی کے لیے زیادہ لائق تھے۔لیکن طالبان قائدین جنہوں نے ۱۹۹۰ء کے وسط سے افغانستان پر حکومت کی تھی پاکستانی مدرسوں کی پیداوار تھے۔القاعدہ کے دہشت گردوں کے محافظین کے طور پر ان کے کردار سے ان کے مدرسوں کے بارے میں دنیا کی دلچسپی میں اضافہ ہوگیا۔

گیارہ ستمبر کے چند ہفتے بعد میں نے دارالعلوم حقانیہ کا دورہ کیا جو اکوڑہ خٹک کے قصبہ میں اسلام آباد سے پشاور جانے والی مین روڈ پر واقع ہے۔طالبان کا لیڈر ملا عمر بھی جامعہ حقانیہ کا طالب علم رہا ہے۔یہ مدرسہ جس میں اس وقت پانچ سے اکیس سال کی عمر کے پچیس سو سے زائد طالب علم پڑھتے ہیں اب ''یونیورسٹی آف جہاد'' کہلاتا ہے۔مدرسہ میں طلبہ کا طرز زندگی عشروں نہیں صدیوں پرانی خصوصیات کا حامل ہے لیکن جامعہ حقانیہ میں میں نے دیکھا کہ مدرسہ کی دنیا اس وقت سے کافی تبدیل ہوچکی ہے جب میں نے حافظ گل محمد کے سامنے اپنا سر آخری بار جھکایا تھا۔

تہ خانے کے بغیر پلستر کی دیواروں والے کمرے میں جہاں کی دیواری گھڑی میں ''اللہ اکبر'' لکھا تھا، ایک نوسالہ طالب علم محمد طاہر بیٹھا ہوا تھا اور قرآن مجید کی وہی آیت حفظ کر رہا تھا جو اسی عمر میں میرے حافظے میں بھی بٹھادی گئی تھی: ''كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ''۔ لیکن جب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ ذرا وضاحت تو کرے اس آیت سے سمجھ کیا رہا ہے؟ طاہر کی تشریح اس پرسکون تشریح سے مختلف تھی جو مجھے سکھائی گئی تھی۔ اس نے کہا: ''مسلمان اللہ کی نظروں میں بہترین قوم ہیں اور لوگوں کی نظروں میں انہیں ہمیں طاقت سے بہترین بنانا چاہیے۔ ہمیں کافروں سے لڑنا چاہیے اور ان سے بھی جن کے نام تو مسلمانوں جیسے ہیں مگر کام کافروں جیسے۔ میں جب بڑا ہو جاؤں گا تو ہر ممکن طریقے سے جہاد کروں گا''۔ طاہر یہ نہیں مانتا کہ گیارہ ستمبر کے واقعات کی ذمہ دار القاعدہ ہے کیونکہ اس کے استادوں نے اسے یہ بتایا ہے کہ یہ حملے طالبان کے خلاف یہودیوں کی سازش تھی۔ وہ ملا عمر اور اسامہ بن لادن کو مسلمانوں کے عظیم قائد سمجھتا ہے ''جنہوں نے کافروں کی طاقت کو للکارا ہے''۔

۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ کے دوران مدرسوں میں نمایاں تبدیلی اور ان کا عالمی پھیلاؤ علاقائی سیاست، فرقہ وارانہ کشمکش اور ٹیکنالوجی کا مرہون منت ہے لیکن سکولوں کا اثر اور ان کے باقی رہنے کا راز ان سماجی اور معاشی حالات میں پوشیدہ ہے جن کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ اسی نے اب تک تبدیلی کے خلاف مزاحمت کی ہے۔ ان خدشوں کے پیش نظر کہ ان مدرسوں سے اب ہر سال ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں مستقبل کے جنگجو تیار ہو رہے ہیں، ان کی اصلاح کرنے کی آوازیں بھی بلند ہو رہی ہیں۔ لیکن جو بھی مدارس کے نصاب تعلیم، طریقۂ تدریس یا ذہنیت کو بدلنے کی امید کرتا ہے تو اس کے مایوس ہونے کا امکان زیادہ ہے۔

اسلامی دنیا میں مدرسے کسی نہ کسی انداز میں افکار کی خانہ جنگی کے مراکز ہیں۔ مغرب زدہ اور عموماً مالدار مسلمانوں کو مذہبی معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں جبکہ علمائے دین، جنہیں جدیدیت نے کنارے پر لگا دیا ہے، کٹر پن پر اصرار کرتے ہوئے اپنی اہمیت جتلاتے ہیں۔ ایک باقاعدہ تعلیم پیسوں کا تقاضا کرتی ہے اور یہ عموماً غرباء کی پہنچ سے باہر ہے لیکن مدرسے مفت میں تعلیم دیتے ہیں۔ ان مدارس میں آنے والے

غریب طلبہ آسانی سے یقین کر لیتے ہیں کہ مغرب، جو بے پرواہ اور لاتعلق لیڈروں کا طرف دار ہے، ان کی بدحالی کا ذمہ دار ہے۔ اور یہ کہ اسلام کی ابتدائی شکل پر عمل انہیں تمام مسائل سے نجات دلا سکتا ہے۔

مدرسوں کی تعداد میں تیز اضافہ

گیارہویں صدی سے مدرسوں کا آغاز ہوا جب سلجوق وزیر نظام الملک حسن بن علی طوسی نے اسلامی قانون کے ماہرین کی تربیت کے لیے بغداد میں ایک مدرسے کی بنیاد رکھی۔ اس وقت اسلام جنوبی افریقہ سے وسطی ایشیا تک دنیا کی آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کا دین بن چکا تھا۔ لیکن قرآن کے علاوہ جسے مسلمان حضرت محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] پر نازل ہونے والا اللہ کا کلام سمجھتے ہیں، کوئی اہم دینی کتب موجود نہیں تھیں۔ مسلمانوں کے غالب فرقے سنیوں کے ہاں پادریوں کے مماثل کوئی طبقہ نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ عامۃ الناس دینی معاملات میں جس سے متاثر ہوتے اس کی پیروی کر لیتے۔ لیکن سُنّی مسلم حکمران مذہب کے ذریعے اپنی حکومت کو جائز قرار دلوا لیتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ ایک قرآنی حکم کو بنیاد بناتے جو مسلمانوں کو ایک نیک حکمران کی فرمانبرداری کا پابند بناتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ باغیوں سے بچاؤ اور ماتحتوں کی اطاعت کو یقینی بنانے کے لیے کسی مذہبی قانون کی تعریف کرنا اور مذہب کی موافقت کا حصول اہم بن گیا۔ نظام الملک کے مدرسے کا مقصد علماء، مفتیوں اور قاضیوں کا ایک طبقہ پیدا کرنا تھا جو مسلم سلطنت کا نظام چلا سکے، اس کے حکمرانوں کو نیک قرار دے اور اسلام کی ایک غیر متبدل شکل کی تعریف کر سکے۔

نویں صدی کے ایک عالم ابوالحسن الاشعری نے مذہبی اصول کی ایسی تعریف کی جسے اس نئے مدرسے (اور بعد میں ظاہر ہونے والے ہزاروں مدرسوں) کے لیے اختیار کر لیا گیا۔ یہ اصول ان کی کئی مناظرانہ انداز کی کتابوں میں درج ہیں، جن میں ان کی کتاب ''الشرح والتفصیل فی الرد علی اھل الافک والتضلیل'' بھی شامل ہے۔ ان کا یہ مذہبی معیار دینی معاملات میں عقل کے کردار کی اہمیت کو رد کرتا ہے اور یہ لازم قرار دیتا ہے کہ ایک مسلمان کے وجود کی مرکزی توجہ دین ہونا چاہیے۔ اس مدرسے نے جو بنیادی نصاب اختیار کیا وہ علم کو دو حصوں منقولات اور معقولات میں تقسیم کرتا ہے۔ کہا جاتا

ہے کہ منقولات میں قرآن، حدیث، تفسیر اور فقہ کا مطالعہ شامل ہے جبکہ معقولات میں عربی زبان اور گرامر جو قرآن فہمی میں مدد دیتی ہیں، منطق، بلاغت اور فلسفہ شامل کیے جاتے ہیں۔

تعلیم کا یہ تصور کئی صدیوں تک اسلامی دنیا میں غالب رہا کیونکہ یہ کافی حد تک غیر متبدل رہا اور اسے کسی نے چیلنج بھی نہیں کیا تھا۔ یہ سلسلہ نوآبادیاتی نظام کی آمد تک رہا جب مغربی تعلیم ان ممالک میں پہنچ گئی جن پر پہلے مسلمان حکومت کرتے تھے۔ ولندیزی نوآبادیاتی حکمرانوں کے دور میں مشرق وسطیٰ، برطانوی ہند اور انڈونیشیا میں جدت پسندی نے مدرسوں کو ایک طرف ڈال دیا۔ جب اسلامی قانونِ عدالت کی جگہ مغربی قوانین نے لے لی تو ان مدرسوں سے فارغ التحصیل ہونے والوں کو بحیثیت جج یا منتظم متعین کرنا ختم ہو گیا۔ مسلمان معاشرے دو حصوں میں بٹ کر رہ گئے۔ ایک طرف مدرسوں سے فارغ ہونے والے ملاّ تھے اور دوسری طرف معاشی طور پر خوشحال مغرب کے تعلیم یافتہ تھے جو جدید سکولوں اور کالجوں میں داخلہ لیتے تھے۔

لیکن غرباء وفادار رہے۔ اکثر مسلمان ممالک میں نوآبادیاتی نظام کے بعد اشرافیہ کی ناکامیوں نے عرب دنیا میں اخوان المسلمون، جنوبی ایشیا میں جماعت اسلامی، اور انڈونیشیا میں نہضۃ العلماء جیسی اسلامی سیاسی تحریکوں کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔ ان تحریکوں نے مغربی اشرافیہ کے جواز کو چیلنج کیا، اسلام کی عظمت رفتہ کی یاد دلانے والے لوگ پیدا کیے اور اسلامی خیالی جنت کی امیدیں پیدا کرنے میں کردار ادا کیا۔ اکثر مثالوں میں اسلامی سیاسی تحریکوں کے بانیوں کی اکثریت جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ دین کی طرف رجحان اور لگاؤ رکھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مدرسوں نے ان کا ساتھ دیا۔

۱۹۷۹ء میں انقلابِ ایران اور افغانستان پر سوویت یونین کے قبضے نے مل کر مسلم دنیا اور مدرسوں کی سوچ میں ایک گہری تبدیلی پیدا کی۔ ایرانی ملاؤں نے شاہ کا تختہ الٹ کر جب حکومت سنبھال لی تو اس تصور کا خاتمہ کر دیا کہ دینی تعلیم دنیاوی معاملات میں بے کار ہے۔ اگرچہ ایران والے اسلام کے اقلیتی فرقہ شیعیت سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے مدرسوں کا مزاج سُنیوں کے مدارس کے مقابلے میں زیادہ سیاسی ہے۔ پھر بھی جُبوں اور کلاہوں میں ملبوس ملک کی حکومت چلانے والے اشخاص کے تصور نے ایک زبردست نظارہ پیش کیا جس نے دور دور تک مدرسوں پر سیاسی اثرات مرتب کیے۔

آیت اللہ خمینی کے انقلابی دور نے شیعیت کے انقلابی تصورات کو دوسری مسلم ریاستوں میں خوب برآمد کیا۔ خمینی نے دوسرے مسلم ممالک میں مدارس کے اساتذہ اور طلباء کو تہران میں منعقدہ سیمیناروں اور فوجی پریڈوں میں شرکت کی دعوت دی۔ اس نے مؤثر اسلامی تحریکوں کو فوجی تربیت اور پیسوں کی بھی پیش کش کی۔ ایرانیوں نے زور دیا کہ بدکردار عرب شہنشاہوں کا ایسے ہی تختہ الٹنا چاہیے جیسے ایرانیوں نے شاہ کا تختہ الٹا ہے۔ ایران کے مخالف عربوں نے اپنے منفرد سُنی بنیاد پرستی کے تصور سے انقلابی شیعی بنیاد پرستی سے لڑنے کا فیصلہ کیا۔ سعودی عرب اور دیگر خلیجی ریاستوں نے اُن سنی مدرسوں میں پیسے لٹانا شروع کر دیے جو ایران کی شیعی دینیات کو رد کرتے ہیں، انہوں نے ایسے علماء کو فنڈ دیئے جو ایرانی شیعیت کو سُنیوں کے لیے ناقابل قبول ماڈل قرار دیتے ہیں اور جو مسلمان حکمرانوں کی بجائے مغربی زوال کے خلاف لڑنے کی دعوت دیتے ہیں۔

اس کشمکش کے دوران مدرسوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا، امریکہ نے افغانستان میں کمیونزم کے خلاف اسلامی مزاحمت پیدا کرنے کے لیے مدد دی۔ اس نے سعودی عرب اور دوسری تیل سے مالا مال ریاستوں کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ افغان مزاحمت اور پوری اسلامی دنیا میں اس کے حامیوں کو فنڈ مہیا کریں۔ اس وقت پاکستان کے فوجی حکمران جنرل ضیاء الحق نے افغان پناہ گزین کیمپوں میں جدید سکولوں کی بجائے مدرسے قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ جہاں پچاس لاکھ بے گھر افغانیوں نے مزاحمت کے لیے قدرتی بھرتی مہیا کی۔ پناہ گزینوں کو سکولوں کی ضرورت تھی اور مزاحمت کو مجاہدین کی ضرورت تھی۔ مدرسہ نہ صرف اس قسم کی تعلیم دے سکتا تھا بلکہ مخصوص اعتقادات راسخ کرنے اور جوش دلانے والے مرکز کے طور پر خدمت سرانجام دے سکتا تھا۔

جنرل ضیاء کا ماڈل پوری اسلامی دنیا میں پھیل گیا۔ حقانیہ مدرسہ کے مہتمم مولانا سمیع الحق ایک شعلہ بیان مقرر ہیں۔ انہوں نے افغانستان پر جنگ شروع ہونے کے فوراً بعد امریکہ کے خلاف جلوسوں کی قیادت کی۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ اپنے پانچ اور چھ سال کی عمر کے بچوں کو سیاسی جلوسوں شامل کرنا مناسب سمجھتے ہیں؟ انہوں نے کہا: ''کوئی بھی اتنا چھوٹا نہیں کہ ٹھیک کام نہ کر سکے''۔ انہوں نے بعد میں کہا: ''بچوں کے ذہن سوچنے کے لیے نہیں ہوتے۔ ہم انہیں مدرسوں میں اس وقت لیتے ہیں جب

وہ بچے ہوتے ہیں اور اس وقت جب وہ سوچنے کے لیے کافی بڑے ہو جاتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کیا سوچنا ہے''۔ طلبہ اور اساتذہ ایک مدرسہ سے دوسرے مدرسے میں اسلامی جہادی ذہنیت لے کر جاتے ہیں۔ میرے بچپن کے ایک مدرسہ کی دیوار پر کسی نے یہ حدیث لکھی تھی: ''اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ کَانَ بِالصِّیْنِ''۔ (علم حاصل کرو چاہے اس کے لیے تمہیں چین کیوں نہ جانا پڑے)۔ حقانیہ مدرسہ کے سامنے سڑک کے پار طاہر کے کسی کلاس فیلو نے ایک دوسری حدیث لکھ دی ہے: وَاعْلَمُوْا أَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّیُوْفِ'' (جان لو جنت تلواروں کے سائے میں ہے)۔

جنرل ضیاء کے تجربے کی کامیابی نے فلپائن، انڈونیشیا، الجزائر اور مراکش جیسے مختلف علاقوں میں اسی انداز میں مفت مدرسوں کے قیام کے لیے رہنمائی کی۔ یورپ اور شمالی امریکہ میں نقل مکانی کرنے والے مسلمانوں نے بظاہر اپنے بچوں کو دینی تعلیم دینے کے لیے مساجد کے ساتھ ساتھ مدرسے قائم کیے ہیں۔ اسلام ایک مسلمان سے اس کی سالانہ آمدنی کا اڑھائی فیصد بطور زکوٰۃ مطالبہ کرتا ہے اور مذہبی تعلیم بھی ان مصارف میں سے ہے جن پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کی جاتی ہے۔ تاہم مدرسہ چلانے کے لیے بہت زیادہ فنڈ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ استادوں کی تنخواہیں بھی کم ہیں، ان کو تحقیق کے لیے بھی فنڈ کی ضرورت نہیں ہوتی اور کتابیں نسل در نسل طلبہ کی ایک کلاس سے دوسری کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہیں۔

خلیجی ریاستوں کی زکوٰۃ اور مالی امداد کی وجہ سے مدرسوں کی تعداد میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ (حقانیہ مدرسہ کے بعض کمروں کی دیواروں پر تحریر ہے کہ ان کمروں کی تعمیر کا سامان سعودی عرب نے مہیا کیا تھا)۔ بین الاقوامی مالی معاونت کا نیٹ ورک پیدا کرنا ہو یا اپنے پیغام کو نئے انداز سے پھیلانا ہو اس سلسلے میں جدید ٹیکنالوجی نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کی مثال آن لائن مدرسے ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں پاکستان میں کل ۲۴۴ مدرسے تھے لیکن گزشتہ سال [۲۰۰۱ء] کے آخر تک یہ تعداد دس ہزار ہو چکی ہے۔ پاکستان کے پرائمری سکولوں میں ۹ء ۱ ملین رجسٹرڈ طلبہ کے مقابلے میں مدرسوں میں ایک ملین طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ اکثر مسلم ممالک اپنے بجٹ کا معمولی حصہ تعلیم کے لیے وقف کرتے ہیں اور بڑھتی ہوئی آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کو سکولوں کے بغیر چھوڑ دیتے ہیں۔ مدرسے اس خلا کو خصوصاً غرباء کے لیے پُر کرتے ہیں۔ غریب ممالک مثلاً پاکستان، بنگلہ دیش، صومالیہ، یمن، اور انڈونیشیا بڑے فخر سے مدارس میں طلبہ کی

بھاری تعداد کا ذکر کرتے ہیں۔

حقانیہ میں تعلیم کے ساتھ ساتھ طعام بھی مفت ہے جو اگرچہ معمولی یا سادہ سی نوعیت کا ہوتا ہے۔ نو بچوں میں سے طاہر کا نمبر ساتواں ہے، وہ مدرسہ میں رہنا پسند کرتا ہے کیونکہ یہ اسے مفت تعلیم دیتا ہے اور اس کے والدین کو کچھ بھی ادا نہیں کرنا پڑتا۔ وہ چالیس تا پچاس طلبہ کی رہائش کے لیے ایک ہال نما کمرے میں رہتا ہے جو فرش پر قالین یا گدا بچھا کر سوتے ہیں۔ وہ دن کا اکثر حصہ ایک استاد کے سامنے کتابوں کو رٹنے میں گزارتا ہے جس کا اپنا بچپن بھی اس طرح گزرا تھا۔ طاہر نے مجھے بتایا: ''مجھ پر اللہ کا بڑا کرم ہے کیونکہ میں اس کا کلام اور اس کے نبیؐ کی تعلیمات سیکھ رہا ہوں۔ بصورت دیگر پناہ گزینوں کے کیمپ میں میں بھی دوسروں کی طرح ہوتا جنہیں نہ کپڑے اور نہ ہی کھانا ملتا ہے''۔

طاہر کے استاد کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا ہوتا ہے اور وہ اسے وحشیانہ طور استعمال بھی کر سکتا ہے۔ پاکستان کے ایک مدرسہ میں طلبہ کو ستونوں کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے جب تک وہ اس دن کا سبق یاد نہ کر لیں۔ لیکن پناہ گزینوں کے متعفن اور گندے کیمپ والی زندگی کے مقابلے میں مدرسہ کی سختی شاید ایک نعمت ہے۔ طاہر کا دن نماز فجر سے پہلے شروع ہوتا ہے، اس کا ناشتہ ایک روٹی اور چائے کے کپ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کا دن نماز عشاء کے بعد چاول اور گوشت کے کھانے کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔ اگر طاہر مدرسہ میں اچھی کارکردگی دکھائے اور سند حاصل کر لے تو کسی مسجد میں بطور خطیب ایک نوکری کی امید کر سکتا ہے۔

واپسی کا کوئی راستہ نہیں

ایک اندازے کے مطابق دنیا میں ساٹھ لاکھ طلبہ مدرسوں میں پڑھتے ہیں۔ اور اس سے دگنی تعداد مکتب مدرسوں میں داخل ہیں۔ (یہ مکتب مدرسے دیہاتوں میں مساجد کے ساتھ ملحق ہوتے ہیں)۔ ان مدرسوں کی ایک بھاری تعداد انتہائی خاموش روایت کی اتباع کرتی ہے جس میں مسلمانوں کو کافروں سے لڑنے کی بجائے مغربی انداز زندگی سے نفرت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ تاہم وہ چند مدرسے جو تشدد کی تعلیم دیتے ہیں اپنے طلبہ میں اسے راسخ کر دیتے ہیں۔

جہادی مدرسہ کسی قدر جدید بات ہے جسے افغانستان میں کمیونزم کے خلاف لڑنے کے لیے کی گئی